بہن کی محبت

از

جناب حامد اللہ صاحب افسر بی، اے

سحر آباد کے ضلع میں چناری ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ چودھری جان محمد عرف جونو خاں اس بستی کے زمیندار تھے۔ سحر آباد میں بھی ان کی کافی جائداد تھی اور ایک روئی کا پیچ تھا۔ خان صاحب مزاج کے اچھے نہ تھے۔ مغرور اور متکبر مشہور تھے لیکن ایک بات سب جانتے ہیں، جونو خاں کیسے ہی کیوں نہ ہوں دل کے بُرے نہ تھے۔ انہوں نے کبھی کسی کو دکھ نہیں پہنچایا کسی کو ستایا نہیں۔ ان کا غصہ آندھی کی طرح چڑھتا تھا۔ مگر سخت سُست الفاظ کا جامہ پہن کر نکل جاتا۔ وہ بادلوں کی طرح گرجتے مگران کی کڑک بے ضرر تھی۔ کبھی دل میں برائی نہ رکھ سکتے تھے۔ جس سے ناراض ہوں اسے بلوائیں گے۔ اس کے گھر خود جائیں گے۔ کھیت پر ہو قصبہ میں ہو کہیں ہو اُسے تلاش کریں گے اور اس سے حرف بحرف سب کہدیں گے۔ بس پھران کا دل صاف ہے۔

یہی وجہ تھی کہ جونو خاں سے ساری بستی کے لوگ گھبراتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود اُن کا اچھا خاصہ اثر تھا ان کی کافی وقعت تھی اور لوگ ان کا لحاظ کرتے تھے۔

جونو خاں مال ومتاع اور وجاہت و امارت کے لحاظ سے خوش نصیب تھے۔ لیکن اولاد کے اعتبار سے بدنصیب تھے۔ خدا نے ایک لڑکی دی سو وہ بھی گونگی صفیہ صورت شکل میں ہزاروں میں ایک تھی۔ مگر خدا نے اُسے قوّت گویائی سے محروم رکھا تھا۔ جب صفیہ کے دماغ میں کوئی خیال آتا اور اس کے اثر سے اس کے ہونٹ پھول کی پتّی کی طرح کانپنے لگتے۔ تو اس کی ماں ٹھنڈے سانس بھرتی۔ صفیہ بہت بھولی بھالی اور سیدھی لڑکی تھی۔ پاس پڑوس کے لڑکے کھیلتے

کو دتے۔ وہ بیچاری سب کا منہ تکا کرتی۔ کوئی اس سے بات نہ کرتا۔ کوئی اس کے پاس نہ آتا۔ گھر میں ایک نیم کا درخت تھا۔ برسات آتی نیم میں جھولا پڑتا۔ لڑکیاں جھولتیں گیت گاتیں۔ مگر بے زبان صفیہ کی کوئی بات نہ پوچھتا۔ تاروں بھری راتوں میں صاف و شفاف آسمان کے نیچے بیٹھ کر سب کہانیاں کہتیں۔ پہیلیاں بوجھتیں مگر صفیہ الگ کھٹولے پر پڑی تارے گنا کرتی۔ معلوم ہوتا تھا کہ تارے اس کے ہمزبان ہیں۔ اور وسیع خاموش اور بارعب آسمان اس کا ہم آواز ہے۔ جب گرمیوں کی دوپہر میں سب سو جاتے۔ جب دنیا کی مصروفیتیں غنودگی میں آجاتیں جب چڑیاں چپ بیٹھ جاتیں تو نیم کے سائے میں ایک بے زبان لڑکی خاموش فطرت سے ہمکلام نظر آتی۔

لیکن صفیہ دنیا میں تنہا نہ تھی۔ اس کے لئے بھی خدا نے ایک ہمدرد سہیلی مہیا کر دی تھی۔ بجو خان کے یہاں ایک گائے تھی۔ کیلی اس کا نام تھا۔ یہ صفیہ کی سہیلی تھی۔ کبھی کیلی نے صفیہ کے منہ سے اپنا نام نہ سنا تھا۔ لیکن وہ اس کے پاؤں کی آہٹ پہچانتی تھی۔ صفیہ گائے کے تھان پر آتی۔ اس کے گلے میں باہیں ڈال دیتی۔ جب صفیہ کو گھر میں کوئی برا بھلا کہتا اور اس کے دل پر چوٹ لگتی آسے تکلیف پہنچتی تو وہ سیدھی اپنی بے زبان سہیلی کے پاس آتی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کیلی اس کے افسردہ چہرے سے اس کے دل کا حال معلوم کر لیتی تھی۔ وہ اپنا منہ اس کے بالوں سے اس کے بازوؤں سے اس کے منہ سے رگڑتی اور مقدور بھر تسلی اور دلاسا دینے کی کوشش کرتی۔

یونہی دن گذرتے رہے۔ آخر صفیہ جوان ہوگئی۔ اس کے بیاہ کا خیال اس

کے ماں باپ کے لئے سوہانِ روح تھا۔ کہیں سے نسبت نہ آتی تھی۔ گاؤں میں لڑکے تھے۔ نیک بھی۔ خوش کردار بھی۔ سمجھدار بھی۔ مگر صفیہ کے لئے نہیں۔ اس غریب کی ایک بے زبانی نے ساری خوبیوں کو ڈھک رکھا تھا۔ صفیہ کی ماں بہ ظاہر ہمدردی حاصل کرنے کے لئے بباطن کسی اور مقصد سے بستی کی عورتوں سے ذکر کرتی۔ کیا کروں جوان لڑکی گھر میں بیٹھی ہے۔ کہیں سے بات نہیں آتی؟ کوئی عیب نہیں۔ کوئی برائی نہیں۔ ایک ہاں خدا نے بے زبان کر دیا ہے۔ آخر کب تک اسے کوٹھے سے لگائے بیٹھی رہوں۔ میں تو کہتی ہوں خدا نوج کسی کو لڑکی دے پالو پوسو، کھلاؤ پہناؤ۔ جب جوان ہو تو گھر سے دھکیلنے کی فکر پڑے۔ مگر اس تمام گفتگو کا اس کے سوا جواب نہ ملتا۔ خدا سب کی مشکل آسان کرتا ہے۔ آخر کہیں نہ کہیں تو نصیب لڑے ہی گا۔

صفیہ کے بیاہ کا مسئلہ چاری کے لوگوں کے لئے فرصت کے اوقات میں گفتگو کا خاص موضوع بن گیا تھا۔ عام رائے تھی کہ جونو خاں اور اس کی بیوی لڑکی کے بیاہ میں تاخیر کے ذمہ دار ہیں۔ جوان بیٹی کو گھر میں بٹھا رکھا ہے۔ یہ بھی نہیں کہ بھوکے مرتے ہوں۔ خدا کا دیا سب کچھ ہے۔ اگر کسی غریب نادار کے ہاں اس طرح خدانخواستہ بے بیاہی لڑکی بیٹھی ہوتی تو اس کو سارے گاؤں میں بٹھا دیتے زندگی دو بھر کر دیتے۔ سچ ہے اپنی آنکھوں کا شہتیر کسے نظر آتا ہے۔

آخر صفیہ کا مقدر جاگا۔ دور کے رشتے سے جونو خاں کی ایک بہن تھی، اس کے ایک لڑکا تھا۔ شہباز نام۔ بہت لاابالی اور الھڑ۔ نہ کردار ٹھیک نہ اطوار درست۔ بے ڈھنگا۔ بے پروا۔ بے خیال خودرائے۔ قرآن شریف کے سوا

اور کچھ پڑھنے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ کیونکہ شہباز کے باپ کا یہ خیال تھا کہ پڑھانا ہمارے خاندان میں سزاوار نہیں۔ جس بچے کو قرآن شریف کے سوا اور کچھ پڑھایا۔ وہی مر گیا۔ لیکن شہباز نے قرآن شریف بھی نہ پڑھا۔ دو تین برس تک گھیر گھار کے کوشش کی مگر ڈیڑھ سپارے سے زیادہ نہ پڑھ سکا۔

خالی اور بے کار آدمی گو خود اپنے گھر میں لعنت اور ملامت کا نشانہ بنائے جاتے ہیں۔ لیکن عام طور پر لوگ انہیں پسند کرتے ہیں اور وہ ہر دلعزیز، اور مقبول عام ہوتے ہیں اور پبلک کی ملکیت سمجھے جاتے ہیں۔ جیسے ہر گاؤں اور قصبے میں کھلی ہوئی جگہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ چوپال ہو یا پارک۔ جہاں کام سے فارغ ہو کر بے فکری سے اٹھیں بیٹھیں اور آزادی سے وقت صرف کریں۔ اسی طرح ہر گاؤں کو دو تین ایسے شخصوں کی ضرورت ہوتی ہے جنہیں دنیا میں کوئی کام نہ ہو۔ تاکہ فرصت کا وقت دلچسپی سے گذر سکے۔ چنانچہ شہباز کو چپاری کا بچہ بچہ جانتا تھا اور قریب قریب ہر شخص اسے پسند کرتا تھا۔

شہباز میں کچھ خوبیاں بھی تھیں۔ وہ دلیر تھا۔ کفایت شعار تھا۔ ملنسار تھا۔ خوش آواز تھا۔ اس وقت اس کی عمر بیس سال کے قریب تھی۔ شکل و صورت کا اگر اچھا نہ تھا تو برا بھی نہ تھا۔ ورزشی جسم تھا اور بچھ ٹاقد۔

اپنی ماں کی تجویز پر صفیہ سے شادی کرنے کے لئے شہباز اسی لئے تیار ہو گیا کہ وہ ایک مال دار باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ جونو خاں کی جائداد اور اس کے سارے مال و متاع کی تنہا وارث تھی۔ سیدھی تھی۔ نیک تھی۔ بے عذر تھی۔

قسمت میں جوڑا لکھا تھا۔ جونو خاں لاکھ بل کھائیں۔ تیوریاں چڑھائیں نیلے

پہلے ہوں۔ کیا ہوتا ہے۔ شادی ہو کر رہی۔ جب مخالفت کی۔ بیوی نے آڑے ہاتھوں لیا۔ اللہ رکھے اٹھارویں برس میں ہے۔ اب یوں کب تک لئے بیٹھی رہوں گی۔ میں نے تو زبان دیدی۔ میں تو اب اپنے قول سے نہ پھروں گی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر لڑکے میں برائی کیا ہے۔ تم تو دشمنوں کے لگائی بجھائی میں آگئے ہو۔ ابھی بچہ ہے کام کرنے کے دن آئیں گے تو کام بھی کرے گا۔ رہی صحبت سو اول تو کوئی خاص برائی نہیں سنی۔ ہر ایک سے ملنے جلنے میں عیب کیا ہے۔ سب تمہاری طرح گھر گھسنے ہو جائیں تو دنیا کا کام کیونکر چلے۔ پھر صحبت کا تو یہ ہے کہ تم درست کر سکتے ہو۔ یہ کوئی گونگے پن کی طرح لاعلاج مرض تو ہے نہیں کہ کسی طرح جا ہی نہیں سکتا۔ صحبت کا درست کرنا تو تمہارے اختیار میں ہو گا۔ جیسے کہو گے کرے گا۔

صفیہ کے بیاہ کو چار برس گذر گئے۔ بے زبان لڑکی لے خاوند کی خدمتگذاری کا حق ادا کر دیا۔ ادھر شہباز بھی سنبھل گیا۔ جونو خاں کے اشاروں پر چلنے لگا۔ سحر آباد والے روئی کے بیج کا انتظام اس نے اس خوبی سے کیا کہ پہلے سے دوگنی آمدنی ہو گی لیکن اس دوران میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا۔ جس نے شہباز کی ساری آرزوئیں خاک میں ملادیں۔ خلاف امید جونو خاں کے ہاں بڑھاپے میں لڑکا پیدا ہوا۔ صفیہ کے ماں باپ کی اس بے موقع۔ بے جا۔ غیر واجب اور نامناسب حرکت سے شہباز کے دل پر ایک تیر سا لگا اور خود صفیہ نے اس نووارد حق دار کو پسندیدہ نظروں سے نہ دیکھا۔

شہباز کے مزاج میں یکایک تغیر واقع ہوا۔ وہ جس قدر ملنسار اور مجلس دوست

واقع ہوا تھا۔ اب اسی قدر تنہائی پسند ہو گیا۔ دوست احباب سے ملنا جلنا ترک کر دیا۔ سحر آباد والا روئی کا بیج بھی عدم توجہی کا شکار رہا پچھلے مہینے آمدنی اور خرچ برابر رہا۔ اس مہینے نقصان کا اندیشہ ہے۔ شہباز کی صحت بھی خراب ہو چلی۔ سست اور خاموش رہنے لگا۔ جو دکھ درد الفاظ کی اعانت سے بے نیاز رہتا ہے۔ وہ دل کی عمیق ترین گہرائیوں میں اتر جاتا ہے اور اندر ہی اندر اپنا اثر کرتا رہتا ہے۔

یہ صفیہ کی مصیبتوں کی ابتدا تھی۔ اس آوازوں سے بھری ہوئی دنیا میں بے زبان ہونا بد قسمتی کے مترادف ہے۔ تھوڑے ہی دن بعد صفیہ کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ مرتے وقت اس نے سال بھر کی جان سلطان کو صفیہ کے سپرد کیا۔ بے ماں کے بھولے بچے نے اپنی معصوم شرارتوں سے بہن کو ایسا گرویدہ کر لیا۔ کہ وہ ایک منٹ کو اُسے گود سے نہ اتارتی۔ وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر اس پر گرتا۔ اپنے چھوٹے سے منہ میں صفیہ کا منہ۔ اس کی ناک۔ اس کے کان۔ اس کی آنکھیں لینے کی کوشش کرتا۔ چھوٹی سی مٹھی میں اس کے بال پکڑ لیتا اور پھر چھڑائے نہ چھوڑتا۔ پو پھٹنے سے پہلے بیدار ہو جاتا اور پوپلے منہ سے غوں غوں کرتا اور صفیہ کو جگائے بغیر باز نہ آتا۔

جب سلطان دو برس کا ہوا تو اس کے باپ کا بھی انتقال ہو گیا۔ اب شہباز سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ جونو خاں کی جائداد کے انتظام میں سوائے اس کے اور کسی کا ہاتھ نہ تھا۔ لیکن سلطان اس کی آنکھوں میں کانٹا سا کھٹکتا تھا۔ پہلے اس نے گاؤں کا کچھ حصہ اپنے بھانجے کے نام برائے نام قیمت پر فروخت

کیا اور اس کا انتظام اپنے ہی ہاتھ میں رکھا۔ مگر یہ تدبیر بھی کچھ کارگر نہ ہوئی۔ جس کے دل میں خود کھوٹ ہو وہ کسی پر اعتماد نہیں کرتا۔ سلطان کے وجود نے اس کے سارے ارادوں پر خاک ڈال دی۔ جب تک یہ صفحۂ ہستی سے نہ مٹ جائے شہباز کی مقصد براری کی کوئی صورت نہیں۔ مگر یہ کیونکر ہو۔ بہن اسے ایک منٹ کو جدا نہیں کرتی۔

رفتہ رفتہ صفیہ کو بھی اپنے خاوند کی سیاہ باطنی کا احساس ہو چلا۔ وہ دیکھتی تھی کہ جتنی سلطان سے وہ محبت کرتی ہے۔ اتنی ہی اس یتیم بچے سے اسے نفرت ہے۔ چنانچہ جس قدر اس کا خاوند سلطان سے حقارت کرتا تھا۔ اسی قدر سلطان کی محبت صفیہ کے دل میں زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ روز بروز میاں بیوی کے دل ایک دوسرے سے ہٹتے گئے۔ اس قسم کے خاموش اختلافات ظاہر اور آشکارا ناتفاقی کی بہ نسبت زیادہ دلنشیں ہوتے ہیں۔

سلطان اکثر بچوں میں کھیلنے کے لئے گھر سے باہر چلا جاتا تھا۔ شہباز کو اس موقع سے فائدہ اٹھانے کا کئی بار خیال آچکا تھا۔ مگر کوئی مناسب صورت نہ نکلتی تھی۔ اس کی تجویز تھی کہ کسی دن دوپہر کے وقت اسے بہلا پھسلا کر کوئی جنگل کو لے جائے اور مار ڈالے تو آسانی سے کام بن جائے گا۔

اس نے قریب ہی بستی کے دو شہدوں کو کافی روپیہ دینے کا وعدہ کر کے اس مقصد کے لئے راضی بھی کر لیا تھا۔ مگر چاری میں کچھ دنوں سے جونو خاں کی جائداد کے متعلق چہ میگوئیاں شروع ہو گئی تھیں۔ اس لئے جب سلطان باہر کھیلنے جاتا تو شہباز دل مسوس کر رہ جاتا کہ اگر جونو خاں کی جائداد کے وارث پر کچھ بھی آنچ آئی تو سوائے میرے اور کسی پر شبہ نہ ہو گا۔

آخر شہباز کی امید بر آنے کا وقت آگیا۔ برطانوی شرقی افریقہ کے کچھ لوگ اس غرض سے ہندوستان آئے ہوئے تھے کہ دیہات کے بیکار لوگوں کو وہاں لے جاکر بسائیں۔ افواہ تھی کہ ان کا ایک ایجنٹ چناری میں بھی آنے والا ہے سارے گاؤں میں شور مچ رہا تھا۔ اصل مفہوم تو کوئی نہ سمجھا۔ یہ خبر اُڑ گئی کہ چند گیدی چپکے سے بچوں کو اٹھا کر لے جاتے ہیں اور انہیں فروخت کر دیتے ہیں۔ چنانچہ دو تین روز سے گاؤں کے میدانوں میں خاموشی طاری تھی۔ ماں باپ بچوں کو باہر نہ جانے دیتے تھے۔ مگر بے زبان صفیہ کے کانوں تک یہ افواہ نہ پہنچی۔ اس لئے سلطان یتیم کو روکنے والا کوئی نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ کچھ تو بچوں کا خاصہ ہے کہ جس بات کو منع کرو اسے خواہ مخواہ کرنے کو جی چاہتا ہے اور کچھ سلطان لاڈ و پیار کی وجہ سے بہت ضدی تھا۔ غرض اُسے اگر کوئی روکتا بھی تو وہ کسی کی نہ سنتا۔ آخر حسب معمول چلا گیا۔ شہباز کے آدمی لگے ہوئے تھے۔ جیسے ہی وہ گھر سے نکلا۔ گود میں اٹھا کر سیدھے ہو لئے۔

دوپہر کا وقت تھا۔ چناری کی کچی گلیاں سنسان پڑی تھیں۔ چڑیاں درختوں کی گنجان شاخوں پر سمٹے بیٹھی تھیں۔ گاؤں کے لوگ چوپالوں میں ڈیوڑھیوں میں پڑے خراٹے لے رہے تھے۔ ہر طرف خاموشی طاری تھی۔ اور ایک بے بس اور یتیم بچے کو دو بے رحم وحشی انسان تھوڑے سے روپیہ کے لالچ میں ہمیشہ کے لئے دنیا سے نیست و نابود کرنے کے واسطے لے جا رہے تھے۔

شام ہو گئی ہر طرف لوگ آنے جانے لگے۔ مگر ابھی سلطان گھر واپس نہ آیا۔ صفیہ کی بے چینی ہر منٹ بڑھتی رہی۔ وہ سینکڑوں مرتبہ دروازے

پر آکر کھڑی ہوئی۔ مگر غریب بے زبان کس سے کہے کہ میرا یتیم بھائی ابھی تک گھر واپس نہیں آیا۔ تھوڑی دیر بعد شہباز گھر آیا۔ صفیہ نے بیتاب اشاروں میں سمجھایا کہ آج سلطان دوپہر کا باہر کھیلنے گیا ہوا ہے۔ اور ابھی تک گھر واپس نہیں آیا۔ شہباز نے بیوی کو کافی تسلی دی۔ مگر اس تسلی میں اپنی ہمدردی اور پریشانی کا اظہار مقصود تھا۔ وہ پریشان اور افسردہ خاطر ضرور تھا۔ مگر اس لئے نہیں کہ سلطان ابھی تک گھر واپس نہیں آیا بلکہ اس لئے کہ راز افشا نہ ہو جائے

رات ہوگئی سارے گاؤں میں شور مچ رہا تھا جتنے منہ اتنی باتیں۔ کوئی کچھ کہتا تھا۔ کوئی کچھ۔ لیکن چناری کا سنجیدہ طبقہ صحیح واقعہ کی تہ تک پہنچ گیا تھا۔

صفیہ کا بُرا حال تھا۔ خدا نے زبان بھی نہ دی تھی کہ پاس پڑوس میں اپنا دکھڑا رو لیتی۔ ساری رات دروازے میں کھڑے گذاری صبح ہوتے سحر آباد سے خبر آگئی کہ وہاں کے سارے گلی کوچے چھان مارے مگر سلطان کا کہیں پتہ نہ چلا۔

دوپہر کے وقت وہی دونوں جلاد کاشتکاروں کے بھیس میں شہباز کے پاس اپنی محنت کا معاوضہ وصول کرنے کے لئے آئے۔ جب شہباز کو یقین ہو گیا کہ اب سلطان دنیا میں موجود نہیں ہے تو روپیہ کا لالچ آیا۔ پانچ سو روپے کی رقم کچھ کم نہیں ہوتی پھر رقعہ نہ پرچہ اور یہ کام اس قسم کا تھا کہ جس کے اظہار سے خود ان پر الزام عائد ہوتا تھا۔ شہباز نے سوچا کہ اگر میں موعودہ رقم نہ دوں گا تو یہ لوگ مجھ سے کسی طرح وصول نہیں کر سکتے چنانچہ اس نے صاف انکار کر دیا۔

فرضی کاشتکاروں نے بہتیرا سہولت کے ساتھ روپیہ وصول کرنے کی کوشش کی مگر جب کسی طرح کار برآری نہ ہوئی تو یہ کہہ کر چل دیئے اب ذرا ہوشیار رہنا۔

شہباز کچھ کھٹکا مگر یہ سوچ کر بے فکر ہوگیا کہ یہ لوگ میرا کر ہی کیا سکتے ہیں، زیادہ سے زیادہ مجھے بدنام کرنے کی کوشش کریں گے اور سلطان کی موت کا الزام میرے سر دھریں گے مگر اس کا ثبوت کیا دیں گے، خیر دیکھا جائے گا۔

رات آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی۔ ہر طرف تاریکی چھا رہی تھی۔ کبھی کبھی ہلکے جھونکے کی سرسراہٹ خاموشی کو عمیق تر بنا دیتی تھی۔ کہ یکایک شہباز کے مکان کی چھت پر دھماکا ہوا۔ صفیہ بخار میں پڑی تپ رہی تھی شہباز بے خبر سو رہا تھا چشم زدن میں دو قوی ہیکل دیو نما انسان، ہاتھوں میں خنجر لئے زینے سے اترے۔ اور ایک دم شہباز کے پلنگ پر پہنچ کر ان میں سے ایک نے اس کے سینے میں خنجر بھونک دیا، صفیہ بیہوش ہوگئی۔ دونوں سفاک قاتل جس قدر نقد و جنس ان کے ہاتھ آیا لیکر خاموشی کے ساتھ جس راستے سے آئے تھے اسی راستے سے چلے گئے اور مصیبت زدہ بے زبان صفیہ دنیا میں تنہا رہ گئی۔

تمام شد